R. R. 3806 51

Regd. No. A 522

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. [illegible]

Telegrams "ANJUMAN"

[illegible]

جلد ۲۱ - شمارہ ۲۹ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - یکم اگست ۱۹۶۲ء

از قاضی معراج دھولپوری

مول چند منشی کا "شاہنامۂ اردو"

فردوسی طوسی (متوفی ۴۱۱ھ) نے اپنے اسلاف کے نام کو زندہ کرنے کے لئے شاہنامۂ فارسی کا آغاز کیا۔ پھر سلطان محمود کے دربار میں جب اس کی رسائی ہوئی تو سلطان نے بھی یہی خدمت اس کے سپرد کی اور ہر شعر کے بدلے ایک اشرفی دینے کا وعدہ کیا۔ پھر یوں مجموعۂ ۳۵ سالہ کی محنت شاقہ کے بعد ۴۰۰ھ میں یہ شاہکار پایۂ تکمیل کو پہنچا مگر انجام کے لحاظ سے فردوسی کا خون جگر بینا المساک ثابت ہوا۔ محمود نے صلے میں اشرفیوں کے بجائے روپے دینا چاہے جن کے لینے سے شاعر نے انکار کر دیا اور اس واقعے سے بددل ہو کر محمود کی ہجو لکھی جو بشمول حالات و واقعات فردوسی شاہنامۂ فردوسی کے دیباچے میں موجود ہے۔[3]

۱۲۳۵ھ میں اردو کے ایک شاعر منشی تخلص نے بھی شاہنامہ بزبان اردو ترتیب دیا۔ موصوف نے سبب تالیف یہ بیان کیا ہے کہ ایک روز "مثل نوروز بہجت فروز" میں "رات کے وقت سامانِ عیش و طرب مہیا تھا" اور محفل "رشکِ بہارِ چمن" بنی ہوئی تھی۔ دوست احباب اکٹھا تھے نیز "ذکرِ شعر و سخن" جاری و ساری۔ اسی سلسلے میں تواریخ کا ذکر بھی ہوا۔ سب نے بیک زبان شاہنامۂ فردوسی کے "باآب و تاب دلکش نظم" اور "تماشا کتاب" ہونے کا اعتراف کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کیا کہ یہ "تاریخِ فرح" ہر کسی کو میسر نہیں۔ "توکل" نامی ایک "مرد سخن سنج" نے بزبان فارسی اس کو مختصر کر کے لکھا ہے جس میں شاہنامے کا تمام احوال مرقوم ہے۔ نام اس مختصر کا "شمشیر خانی" ہے۔ پس منشی کے "برادر مہربان" "زور آور" نے پرسش کر اپنے بھائی کو متوجہ کیا کہ وہ اس کو "باآب و تاب نظم میں ترتیب دے کر" "بزبان ریختہ" لکھ دیں۔ چنانچہ منشی نے "باصد طرب" اس کی تعمیل کی اور "شمشیر خانی طلب کر کے" "بدل و جان مصروف کار ہو گئے"۔ نیز "شام و سحر فکر اشعار میں" "گم رہ کر" "دلکش و آبدار نظم" تیار کر لی۔ جس کی تاریخ اختتام مندرجۂ ذیل قطعے میں شاعر نے خود منضبط کی ہے۔[1]

مرتب یہ شاہنامہ جب ہو چکا — کیا فکر تب سال و تاریخ کا
تو پھر ہاتفِ غیب نے مسجدم — کہا۔ قصۂ خسروانِ عجم

۱۲ ھ ۳۵

مادۂ مذکور کے اوپر کتاب میں اعداد ۱۲۳۰ درج کئے گئے ہیں جو سہو پر مبنی ہیں کیونکہ اس سے ۱۲۳۵ھ اخذ ہوتے ہیں۔ دتاسی نے ۱۸ دسمبر ۱۸۶۱ء کے خطبے میں شاہنامۂ اردو کا ذکر دو مقام پر کیا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں خطبات کا جو ترجمہ انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہوا ہے، اس میں صفحہ ۲۸۰ کے فٹ نوٹ میں شاہنامۂ زیر بحث کا نام "خسروانِ عجم" بتایا گیا ہے جو صحیح نہیں۔ یہ بشمول لفظ "قصہ" مادۂ تاریخ ہے۔ نام اس کا "شاہنامۂ اردو" ہے جو کتاب کے سرورق پر مطابق دستور معہ خط تحریر میں لایا گیا ہے۔

خطبۂ مذکور میں دتاسی نے یہ بھی بتایا ہے کہ "شمشیر خانی" کے اس منظوم ترجمے کے علاوہ نثر میں بھی اس کے دو ترجمے کئے گئے ہیں۔ ایک تو محمد علی ترمذی نے کیا ہے اور دوسرا بحکم واجد علی شاہ سلطان اودھ مرزا رجب علی بیگ سرور نے آغاز کر کے سال ۱۲۶۲ھ میں ہے۔ صفحات اس کے ۱۵۷ ہیں اور نام "سرور سلطانی"۔ نیز اس وقت کے رواج کے

۱؎ فردوسی سے سی و پنج سال از سرائے سپنج - بسے رنج بردم بامید گنج

۲؎ فردوسی سے ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار - کہ گفتم من این نامۂ شہریار

۳؎ شعر العجم جلد اول و شاہنامہ فردوسی مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ [illegible]

۱؎ "دو دین" کے الفاظ اس نظم میں خود شاعر کے الفاظ ہیں۔

۲؎ میر تقی میر کا سال وفات بھی یہی ہے۔

مطابق اس کی عبارت صحیح ہے ۱۸۴۵ء/۱۲۶۱ھ میں یہ پہلی بار مطبع نول کشور میں چھپا ہے۔ ۱۸۸۷ء/۱۳۰۴ھ کے ایڈیشن میں مالک مطبع نے مشکل الفاظ کی ایک فرہنگ بھی آخر میں شامل کرائی ہے[۱]۔ رام بابو سکسینہ نے تاریخ ادب اُردو اور منشی نوبت رائے نظر نے ایک مضمون مطبوعہ زمانہ کانپور ماہ مارچ ۱۹۱۹ء میں بھی سرورؔ کے ترجمے کا ذکر کیا ہے۔

منشی کا نام مول چند اور کایستھ ماتھران کی ذات ہے۔ شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد اور دہلی کے رہنے والے ہیں۔ شاہ عالم بادشاہ کے قدیم ملازمین میں ان کا شمار تھا۔ شاہنامۂ زیر بحث کے علاوہ ایک دیوان اور "سام نامہ" بھی ان کی تصنیف سے ہے۔ صاحب آثار الشعرائے ہنود نے شمشیر خانی کے ترجمے کے ساتھ ساتھ منشی کو "شاہنامۂ فردوسی" کا بھی مترجم بتایا ہے جو احتمال سے خالی نہیں۔ ۱۸۳۲ء/۱۲۴۸ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے[۲]۔

شاہنامے کا نسخہ زیر نظر ۱۸۶۰ء/۱۲۷۶ھ میں بمطبع درخشانی بابو مطبع چھوٹے لال نے طبع کیا ہے[۳]۔ مطبع کے مستقر کا ٹائٹل پیج سے کوئی سراغ نہیں ملتا۔ کتاب کے آخری صفحات ضائع ہوگئے ہیں۔ صرف ۱۷۶ صفحے محفوظ ہیں۔ ہر صفحے میں پچیس سطریں ہیں اور ہر سطر میں دو دو شعر معرض تحریر میں لائے گئے ہیں۔ صفحات کے شمار میں سرورق کا بیرونی حصہ بھی شامل ہے جس پر گل بوٹوں کے درمیان کتاب کا نام مندرج ہے کاغذ اس کا سفید اور خط صاف ہے۔ اس کی ابتدا حمد سے کی گئی ہے۔ پھر مناجات اور نعت سرور کائنات ہے۔ زاں بعد "ابو نصر معین الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ دہلی (۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ - ۱۸۳۷ء/۱۲۵۳ھ) کی تعریف میں کچھ اشعار منضبط کرکے سبب تالیف کتاب اور تاریخ اختتام حوالۂ قلم کی ہے۔ صفحہ ۵ سے شاہنامے کے اصل مضمون کا آغاز ہوتا ہے خلاصے کے طور پر عنوانات بزبان فارسی قائم کرکے کیومرث ہوشنگ وغیرہ شاہانِ ایران اور متعلقہ لڑائیوں کے حالات سپرد قلم کئے گئے ہیں نسخۂ ہذا باتصویر ہے۔ بحر اس کی متقارب مثمن محذوف الآخر یا مقصور الآخر ہے۔

علمائے عروض نے مثنوی کی اس بحر کو کارزار اور معاملات سلاطین کے لکھنے کے لئے مختص رکھا ہے چنانچہ شاہنامۂ اُردو بھی اسی وزن میں لکھا گیا۔ اس سے مترجم کی عروضی استطاعت پر روشنی پڑتی ہے۔ فردوسی نے بھی شاہنامہ اسی بحر میں موزوں کیا ہے۔ ارکان اس کے فعولن فعولن فعولن فعل یا فعول پر مشتمل ہیں[۴]۔

قطع نظر دیگر حالات و واقعات ارباب قلم نے اس حصّے پر خصوصی توجہ مبذول کی ہے جس میں رستم[۵] و سہراب کی جنگ کا منظر دکھایا گیا ہے۔ عہد وکٹوریہ کے مشہور انگریزی شاعر میتھیو آرنلڈ (Matthew Arnold) نے بھی اس حصّے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور زبان انگریزی میں منتقل کیا ہے۔ جس کا ادب میں ایک نمایاں مقام ہے۔ لہٰذا ہم بھی بسطور ذیل بطور نمونہ شاہنامۂ اُردو سے اسی حصّے کو نقل کرتے ہیں۔ یہ تو مسلّم ہے کہ اس میں فردوسی کا سا زورِ قلم، معرکہ آرائی اور تفصیلات نہیں اور نہ ایسا ممکن ہی تھا کیونکہ یہ خلاصۂ کتاب سے ماخوذ ہے اور پھر دونوں شاعروں میں کوڑی مُہر کا فرق بھی۔ تاہم چونکہ منشی نے اس مثنوی کے ذریعہ اُردو داں طبقے کو تاریخ ایران سے پہلی بار روشناس کرایا ہے نیز دوسری زبان سے ترجمہ کرکے اُردو زبان کی ایک گونہ خدمت انجام دی ہے اس لئے وہ قابل داد و لائق تحسین ضرور قرار پاتے ہیں۔ مضمون مشار الیہ کا عنوان "کشتہ شدن سہراب از دست رستم بروز دیگر و زخم نمودن رستم در ماتمش" قائم کرکے لکھا ہے کہ[۶]؎

سحر دیکھ کر قوت و زور تن	ہوا شاد ماں پہلوان زمن
سپاس خدا بابت پروردگار	بجالا کے اور رخش[۷] پر ہو سوار

۱؎ مضمون بعنوان "رجب علی بیگ سرورؔ" نوشتہ ذکریا صاحب وکیل بجنور مشمولہ علی گڑھ میگزین صلا تا صلا تنقیدات نمبر جلد ۱۰ نمبر ۲ (غالباً ۱۹۳۲ء) و سیر المصنفین جلد اول از مولوی محمد یحییٰ تنہا مطبوعہ جامعہ پریس دہلی ۱۹۲۴ء و اُردو فائنل ریڈر مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد ۱۹۱۸ء (تیسرا ایڈیشن) نیز تاریخ نثر اُردو صفحہ ۱۲۹ از مولانا احسن مارہروی مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۳۰ء مطابق ۱۳۴۹ھ۔

۲؎ آثار الشعرائے ہنود اور گلشن بے خار سے یہ حالات ماخوذ ہیں۔ شعرالہند جلد دوم صلا سے معلوم ہوتا ہے کہ "تذکرہ گلستان سخن" میں بھی مول چند منشی کا حال تحریر ہے۔

۳؎ منشی مول چند کے شاہنامۂ اُردو کو رسوامن دیال نے بخط ناگری منتقل کیا ہے۔ یہ بھی باتصویر ہے اور حسب خواہش شائقین مطبع اودھ اخبار کے منیجر کے ایماء پر ۱۸۸۰ء میں چھپا ہے۔ صفحات اس کے ۳۹۰ ہیں نیز حاشیہ پر مشکل الفاظ کے سریع الفہم معنی بھی لکھے ہیں۔ (دیکھیے فہرست مطبوعات اودھ اخبار ۱۸۸۸ء صیغۂ ہندی)

۴؎ موضوع زیر بحث پر مشتمل فارسی کی مشہور و متداول مثنویاں شاہنامہ قاسم گنابادی، سکندر نامۂ خواجہ نظامی اور سکندر نامۂ ہاتفی کا وزن بھی یہی ہے نیز اُردو میں تاریخ بدیع منشی امیر اللہ تسلیم، سکندر نامۂ اُردو سید معین الدین احمد، ادیبانہ عبارت منشی طوطارام شایاں بھی اسی بحر میں موزوں کی گئی ہیں مگر شعرائے عروض کے اس اصول کی سختی سے پابندی نہیں کی۔

۵؎ رستم شاہ ایران کا نامور پہلوان تھا۔ اس کے باپ کا نام زال اور دادا کا نام سام تھا۔ سہراب اس کا ایک لڑکا تھا جو بچپن ہی سے باپ سے جدا تھا اور اپنی ماں کے پاس رہا کرتا تھا۔ جوان ہونے پر سہراب نے شاہ توران افراسیاب کے یہاں ملازمت کرلی اور رستم شاہ کیکاؤس بادشاہ ایران کے یہاں ملازم تھا۔ ایک مرتبہ دونوں بادشاہوں میں جنگ ہوئی اور باپ بیٹے کا مقابلہ ہوا۔ نہ باپ بیٹے کو پہچانتا تھا اور نہ بیٹا باپ کو۔ آخر باپ نے اپنے بیٹے کے خون میں ہاتھ لال کئے بعد کو جب معلوم ہوا کہ یہ وہی بد نصیب باپ ہوں جس نے اپنے بیٹے کو مار ڈالا تو بہت کچھ صرف حسرا و گریہ و زاری کی مگر یہ سب بے سود تھا۔ سہراب کی ماں توران کی رہنے والی تھی۔

۶؎ رستم و سہراب کا مقابلہ ایک یوم قبل ہو چکا تھا جس میں سہراب نے رستم کو پچھاڑ لیا تھا اور قریب تھا کہ مار ڈالے مگر رستم نے حیلہ کرکے اپنی جان بچائی اب بروز دیگر یا دوبارہ مقابلہ میدان میں آتا ہے جس کا حال منقولہ اشعار سے ظاہر ہوگا۔

۷؎ رخش رستم کے گھوڑے کا نام ہے جو دلیری و قوت میں بے نظیر تھا۔ اسی پر سوار ہو کر وہ معرکوں میں جاتا تھا۔

(باقی صفحہ ۶ پر)

ہماری زبان

یکم اگست ۱۹۶۲ء

انجمن کے نئے صدر

آزاد ہندوستان میں جب انجمن ترقی اُردو ہند کی نئی تنظیم ہوئی تو اس کے پہلے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ۱۹۵۵ء کے آخر میں مصروفیت کی بنا پر استعفا دے دیا اور کچھ عرصے تک جناب عبدالحمید خواجہ نائب صدر صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۶ء میں کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی کو انجمن کا صدر منتخب کیا گیا۔ صدر کا انتخاب پانچ سال کے لئے ہوتا ہے۔ اب نئے انتخاب میں پنڈت ہردے ناتھ کنزرو صدر منتخب ہوئے ہیں ڈاکٹر عابد حسین اور پنڈت سندرلال نائب صدر چنے گئے ہیں۔

کرنل بشیر حسین زیدی نے باوجود اپنی مصروفیات کے انجمن کے کاموں میں گہری دل چسپی لی اور ہر موقع پر ہدایت اور رہنمائی کرتے رہے۔ انجمن ان کی شکرگزار ہے اور توقع کرتی ہے کہ یہ اب بھی اپنے مشوروں سے ہماری مدد کرتے رہیں گے۔ انجمن کے نئے صدر پنڈت ہردے ناتھ کنزرو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ ملک کے اُن قومی، تعلیمی اور تہذیبی رہنماؤں میں سے ہیں جن کی گراں قدر خدمات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سروینٹس آف انڈیا سوسائٹی سے ساری عمر کے تعلق کی وجہ سے اُنھوں نے مخلصانہ، خاموش اور بے غرض تعلیمی اور تہذیبی کام کی ایک روایت قائم کی ہے۔ ملک کے تعلیمی اداروں سے ان کا گہرا تعلق رہا ہے۔ کونسل آف اسٹیٹ کے ممبر کی حیثیت سے اُن کی "حق گوئی و بے باکی" سب پر روشن ہے۔ وہ اُردو اور فارسی ادب پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ریاستوں کی نئی تنظیم کے کمیشن کے ممبر کی حیثیت سے اُنھیں کی نظر لسانی اقلیتوں کے مسائل پر پڑی تھی اور رپورٹ کے ایک پورے باب میں انھوں نے لسانی اقلیتوں کے لئے مناسب تحفظات پر زور دیا تھا۔ انجمن کی ۱۹۶۲ء کی کل ہند کانفرنس منعقدہ کان پور میں اُن کا خطبہ حکومت اور عوام دونوں کے لئے ایک دستورالعمل تھا۔ وہ ہمارے اُن بزرگوں میں سے ہیں جن کا احترام سارے ملک میں کیا جاتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اُن کی صدارت کے دور میں اُردو کا قومی رول اور واضح ہوگا۔ حکومت اور عوام اُردو دوستوں کی جائز شکایات کو دور کریں گے اور اُردو کی بقا اور ترقی کے لئے راہیں کھلیں گی۔

غالب سنٹنری

ہماری زبان کے یکم جون کے اداریئے میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ ۱۹۶۹ء میں ہونے والی غالب کی سنٹنری کے لئے ابھی سے تیاریاں شروع کر دینی چاہئیں۔ اس سلسلے میں شروع جولائی میں دہلی میں کچھ اُردو دوست جمع ہوئے تھے اور اُن کی رائے یہ تھی کہ انجمن کو ایک مرکزی کمیٹی اس کام کے لئے بنانا چاہیے۔ چنانچہ ۱۵ رجولائی کے اجلاس میں انجمن کی مجلس عاملہ اور مجلس عام نے تیرہ اشخاص کی ایک کمیٹی بنائی ہے جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین اور سکریٹری جناب احمد محی الدین ہیں۔ کمیٹی بہت جلد اپنے جلسے شروع کرے گی اور بڑے پیمانے پر کام کا منصوبہ بنائے گی۔

ضرورت ہے کہ اُردو کے ادارے، یونی ورسٹیوں کے اُردو شعبے، ادبی ادارے، ناشر، مکتب فروش، اخبار نویس سب اپنے طور پر اس موقع کے لئے ایک پروگرام بنائیں مرکزی کمیٹی ان کاموں کو مربوط کرے گی اور ان کے لئے جو سہولتیں مہیا کر سکے گی کرے گی۔ مرکزی کمیٹی اس سلسلے میں ساہتیہ اکاڈمی، وزارت تہذیبی امور اور وزارت اطلاعات کو بھی توجہ دلائے گی۔ علاوہ تمام اداروں کے کاموں کو مربوط کرنے کے، کمیٹی ۱۹۶۹ء کی تقریبوں کا پروگرام بنائے گی اور غالب کی مناسب یادگاریں قائم کرنے کے مسئلے پر غور کرے گی۔ بظاہر ابھی بہت وقت ہے، لیکن علمی کاموں کے منصوبے خاصی مدت چاہتے ہیں۔ اس لئے تصنیف و تالیف کا پروگرام ابھی سے شروع ہو جانا چاہیے۔ ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ہدایت میں سارے پہلوؤں پر مناسب توجہ ہوگی اور ہم جلد ہی ملک میں غالب کے شایان شان کاموں کا ایک جال پھیلا سکیں گے۔

ملک میں ۱۲ نئی یونیورسٹیاں قائم ہوں گی

یہ بات سرکاری طور پر معلوم ہوئی ہے کہ تیسرے پنجسالہ منصوبے کے دوران خیال ہے کہ ملک میں ۱۲ نئی یونیورسٹیاں قائم کی جائیں گی۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے گزشتہ ستمبر کو یونیورسٹیاں قائم کرنے کی مختلف تجاویز پر غور کرنے کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس نے اپنی ایک عبوری رپورٹ میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ہر ریاست میں کم سے کم ایک وحدانی یا وفاقی طرز کی یونیورسٹی کھلنا چاہیے۔ کمیٹی کی تجویز ہے کہ جے پور کی یونیورسٹی کو وفاقی یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا جائے اور جودھپور کی یونیورسٹی کو اس سے ملحق کر دیا جائے۔ کمیشن نے بنگلور اور پونا میں وفاقی یونیورسٹی کے قیام کی تجویز بھی رکھی ہے۔ اسی طرح سے عثمانیہ یونیورسٹی کو وفاقی یونیورسٹی بنا دیے جانے کی تجویز ہے۔ فی الحال ملک میں ۴۵ یونیورسٹیاں اور ۵ اعلیٰ تعلیم کے لئے کل ہند ادارے ہیں۔

مرکزی انجمن کے جلسوں کی روداد

۱۵ جولائی ۱۹۶۲ء کو انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس عاملہ اور مجلس عام کا مشترکہ جلسہ انجمن کے صدر دفتر میں منعقد ہوا، جس میں حسب ذیل ممبروں نے شرکت فرمائی:

(۱) عبدالمجید خواجہ (صدر)
(۲) ڈاکٹر سید عابد حسین
(۳) ڈاکٹر عبدالعلیم
(۴) ڈاکٹر مسعود حسین خاں
(۵) سید شہاب الدین دسنوی
(۶) الطاف احمد خیری
(۷) مولوی حبیب الرحمن
(۸) شاہ معین الدین ندوی
(۹) پروفیسر سید مسعود حسن رضوی
(۱۰) بیگم انیس قدوائی
(۱۱) حمیدہ سلطان
(۱۲) پروفیسر آل احمد سرور
جنرل سکریٹری

انجمن کے نئے صدر و نائب صدر

پنڈت ہردے ناتھ کنزرو	صدر
ڈاکٹر سید عابد حسین	نائب صدر
پنڈت سندر لال	نائب صدر

گزشتہ جلسہ کی روداد کی توثیق کے بعد جنرل سکریٹری نے اطلاع دی کہ مسلسل چار جلسوں میں شرکت نہ کرنے کی وجہ سے سید سجاد ظہیر صاحب اور محمد اجمل خاں صاحب حسب قواعد انجمن، انجمن کے ممبر نہیں رہے ہیں ان کی جگہیں خالی تصور کی جائیں۔ طے پایا کہ ان جگہوں کو خالی سمجھا جائے اور انھیں پُر کرنے کے لیے حسب قواعد انجمن کارروائی کی جائے۔

جنرل سکریٹری نے انجمن کی سالانہ رپورٹ بابت سال ۶۲-۱۹۶۱ء پیش کی اور مجلس نے بعض اضافوں کے ساتھ اس کو منظور کیا۔

صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں جو عرضداشت ۱۹۵۸ء میں پیش کی گئی تھی اس سلسلے میں مزید کارروائی کے لیے طے پایا کہ انجمن کے مطالبات کو دوبارہ حکومت ہند کے سامنے لانا چاہیے۔ صدر اور سکریٹری کو ہدایت کی گئی کہ اس سلسلے میں جلد سے جلد مناسب اقدامات کی تجویز مجلس عاملہ کے سامنے پیش کریں۔

جنرل سکریٹری نے حسب ذیل تجویز پیش کی جو منظور ہوئی:

۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی کل ہند پیمانے پر منانے کے لیے انجمن ترقی اردو ہند ایک ایسی مرکزی کمیٹی کا قیام ضروری سمجھتی ہے جو ایک طرف اردو کے اداروں، یونیورسٹیوں کے اردو کے شعبوں، اردو کے ناشروں، اخباروں اور ملک کے دوسرے ادبی اداروں کے کام کو مربوط کرے اور دوسری طرف صد سالہ برسی کے منانے کے لیے مناسب تقریبات کا انتظام کرے اور حکومت اور عوام کی مدد سے غالب کے شایانِ شان مستقل یادگاریں قائم کرے۔

کمیٹی کے ممبران حسب ذیل ہوں گے:

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین (صدر)
(۲) پروفیسر ہمایوں کبیر
(۳) ڈاکٹر گوپالا ریڈی
(۴) پنڈت ہردے ناتھ کنزرو
(۵) کرنل بشیر حسین زیدی
(۶) ڈاکٹر تارا چند
(۷) مہدی نواز جنگ
(۸) ڈاکٹر رام پرکاش راؤ
(۹) بیگم صاحبہ بھوپال
(۱۰) پروفیسر آل احمد سرور
(۱۱) حمیدہ سلطان صاحبہ
(۱۲) دیوان آنند کمار
(۱۳) احمد محی الدین صاحب (سکریٹری)

یہ کمیٹی جلد سے جلد اپنا کام شروع کر دے۔

مجلس نے سبکدوش ہونے والے عہدہ داروں کو حسب ذیل الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کیا:

"انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس عاملہ و عام کا یہ مشترکہ جلسہ جناب کرنل بشیر حسین زیدی اور جناب عبدالمجید خواجہ صاحب کی ان گراں قدر خدمات کا جو انھوں نے صدر اور نائب صدر کی حیثیت سے انجام دیے ہیں تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے اور ان حضرات سے درخواست کرتا ہے کہ آئندہ بھی انجمن کو اپنے قیمتی مشورے اور مدد سے مستفید فرماتے رہیں۔"

درسی کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں مولوی حبیب الرحمن صاحب کا خط پیش ہوا اور موصوف نے خود بھی اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

مجلس نے اصولاً اس تجویز سے اتفاق کیا کہ یونیورسٹی کے درجوں کے لیے اردو میں مناسب کتابیں تیار کی جائیں اور حبیب الرحمن صاحب سے درخواست کی کہ وہ ایک مفصل سکیم جلد تیار کریں جسے اگلے جلسے میں پیش کیا جائے۔

اردو کالج کی امداد کے سلسلے میں حبیب الرحمن صاحب کا دوسرا خط پیش ہوا اور طے پایا کہ اس سلسلے میں سکریٹری مناسب کارروائی کریں۔

اسرار اکبرآبادی

صحرا اور مسافر

اک اجاڑ صحرا کے
خوفناک آنگن میں
ظلمتوں کے سناٹے
ہر طرف سسکتے ہیں
سسکیاں سی بھرتے ہیں
جب ہوائیں چلتی ہیں
پیڑیوں لرزتے ہیں
جیسے اس اندھیرے میں
کچھ مزار پھٹتے ہیں
اور ان کے اندر سے
کالے کالے بھوتوں کی
ٹولیاں نکلتی ہیں
وہ جدھر بھی جاتی ہیں
اپنا رقص کرتی ہیں
شور بھی مچاتی ہیں
الوؤں کی آوازیں
ان کا ساتھ دیتی ہیں
اس اجاڑ صحرا کے
ہولناک منظر سے
اجنبی مسافر کا
عزم ڈگمگاتا ہے
راہ بھول جاتا ہے
اور اداس قدموں سے
ہر طرف بھٹکتا ہے
اک اجاڑ صحرا کے
خوفناک آنگن میں

آفتاب شمسی

ناسور

پھر چلا آیا مرے ذہن کے دروازے پر
خون اور پیپ بھرے ہاتھوں سے دستک دینے
ایک مفلوج بھکارن کا سسکتا بچہ
جس کے پھوڑوں سے ہر وقت رِسا کرتا ہے
خون آلود، متعفن بھرا، زہریلا مواد
سہم جاتے ہیں جسے دیکھ کے اکثر راہی
دینا چاہے بھی اگر کوئی اسے کچھ خیرات
اس کے نزدیک پہنچتے ہوئے گھبراتا ہے!
اور بدبخت بھکارن کو تذبذب دن رات
مر گیا یہ تو وسیلہ بھی نہیں ہے کوئی!
ہو گیا ٹھیک تو پھر بھیک ملے گی کیسے؟
مامتا اس طرف، اس سمت ہے روٹی کا سوال
رات دن خود سے وہ اک جنگ کیا کرتی ہے
شب ڈھلے جب بھی گزرتا ہوں ادھر رستے سے

وہ بھکارن غم و اندوہ کی چادر اوڑھے
ملگجی روشنی، سہمی ہوئی تنہائی میں
اپنے سڑتے ہوئے بچے کو کلیجے سے لگائے
غم کے احساس سے مسحور نظر آتی ہے
ایک رِستا ہوا ناسور نظر آتی ہے

کرشن موہن

قطعات

اداسی

فضا پر چھا گیا ابرِ بہاراں
ہے وقتِ عشرتِ بادہ گساراں
مگر میری اداسی مستقل ہے
کبھی تھمتی نہیں یہ چشمِ باراں

تضاد

شاخِ پژمردہ جوانی میری
جس پہ حسرت کے نشاں ملتے ہیں
ایک فردوسِ حسیں تیرا شباب
جس میں عشرت کے کنول کھلتے ہیں

ویرانی

گا رہے ہیں کیوں زمانے کے چلن
ایک عالمگیر ویرانی کا راگ
سرد مہری ہے فضاؤں پر محیط
لٹتا جاتا ہے محبت کا سہاگ

غزلیں

بہار بیوتی

ہر قدم شورشِ حالات کہاں تھی پہلے
زیست محتاجِ آفات کہاں تھی پہلے
گردشِ جام کا افسانہ ہے جس سے تو بھرم
تیرے میخانہ میں یہ بات کہاں تھی پہلے
چشمِ نظارہ کی ہو گئی تری محفل میں
گرم بازاریٔ جذبات کہاں تھی پہلے
ہائے وہ خوش ہے کہ بھی ملتا نہیں ہے پہلو میں
دوستی اتنی بھی بات کہاں تھی پہلے
ان کے جلووں کی ہے رعنائی تخیلِ بہار
یہ جواں دن یہ حسیں رات کہاں تھی پہلے

رئیس اجمیری

یہ زمیں چپ ہے آسماں چپ ہے
درد کی گود میں جہاں چپ ہے
حسرتوں کی ہے چاندنی مدھم
آرزوؤں کی کہکشاں چپ ہے
منزلیں دور، راستے موہوم
راہبر گم ہے کارواں چپ ہے
ہے زمیں کس کے سوگ میں ساکت
کیا خبر کیوں یہ آسماں چپ ہے

بقیہ: مولچند منشی کا شاہنامۂ اردو

گیا شاہ توران سوئے رزمگاہ   ہوا جا کے سہراب سے کینہ خواہ
یہ سہراب نخوت سے کہنے لگا   کہ چنگال سے میرے ہو کر رہا
تو پھر آج آیا سوئے کارزار   عزیز اپنی شاید نہیں جان زار
تہمتن[2] یہ بولا کہ جب تک ہے جان   ترے ساتھ ہونگا ستیزہ کناں
وہ کرنے لگے پھر جو کشتی بہم   ہوئے مائل زور کشتی بہم
بہم خوب زور آزمائی ہوئی   نہ سہراب کو پھر رہائی ہوئی
پکڑ کر کمربند سہراب کا   زمیں سے لیا پہلتن نے اٹھا
پٹک کر زمیں پر اسے پھر وہیں   سرِ سینہ بیٹھا وہ از روئے کیں
یہ سوچا کہ یہ گرد زور آزما   جو پھر اٹھ کھڑا ہو تو پھر ہے کیا
غرض کھینچ کر خنجر آبدار   کیا سینہ و دل کو اسکے فگار
وہ خستہ جگر کھینچ کر ایک آہ   یہ بولا کہ تھے بخت میرے سیاہ
جہاں میں جو آیا تو یہ تھی مراد   کہ دیدار سے باپ کے ہوں میں شاد
تمنائے دل کچھ نہ حاصل ہوئی   بملک عدم جان واصل ہوئی
جو دریا میں اب جا کے مسکن کریں   تو یا جائے بالائے چرخ بریں
مرا باپ تجھ کو نہ چھوڑے گا واں   کرے گا ہلاک آن کر اے جواں
کہا نام کیا اس نے تب یوں کہا   کہ ہے نام رستم مرے باپ کا
جب اس خستہ تن سے سنا یہ سخن   تو غش ہو گیا رستم پیل تن
پڑا ہو کے بیہوش پس خاک پر   جب آیا ذرا ہوش تب نالہ کر
لگا کہنے اس سے کہ کر یہ بیاں   ترے پاس رستم کا کیا ہے نشاں
کہ میں ہی سیہ بخت رستم ہوں آہ   جہاں جسکی آنکھوں میں ہووے سیاہ
یہ سہراب نے سن کے پاسخ دیا   کہ صد حیف اے گرد کشور کشا
بہت گرم الفت مرا دل ہوا   دلے تو ادھر کچھ نہ مائل ہوا
نشانی تو دیکھو اب زرہ کر کے وا   کہ[3] مہرہ ہے بازو پہ میرے بندھا
نہیں زخم سے اب طاقت مجھے   جو کھولوں زرہ اور دکھاؤں تجھے
وہ مہرہ جو دیکھا زرہ کر کے وا   تو رستم نے پھر شور و نالہ کیا
یہ بولا کہ اے جان من بے گناہ   تو کشتہ ہوا ہاتھ سے میرے آہ
پسر کو کسی نے بھی مارا نہیں   نہیں یہ ہوا جور ہرگز کہیں
نہ چھوڑے گا زنہار مجھکو یہ غم   رہوں گا گرفتار رنج و الم
یہی اب ہے بہتر کہ ہوں میں ہلاک   کروں اپنے سینہ کو خنجر سے چاک
یہ سہراب بولا کہ کیا فائدہ   نہیں چارہ زنہار پیش قضا
تڑپتا تھا سہراب بسمل ادھر   ادھر رستم گرد تھا نوحہ گر

اس کے بعد رستم کی واویلا اور گریہ وزاری کا دردناک منظر بہ الفاظ ذیل دکھایا گیا ہے یہ اس وقت کا سماں ہے جب سواران لشکر رستم رزمگاہ کی جانب گئے ہیں اور انھوں نے رستم سے دریافت حال کیا ہے تو —

زرہ پارہ اور چاک کر پیرہن   لگا کہنے یوں رستم پیل تن

ہوا ہاتھ سے میرے ایسا ستم   رہے گا قیامت تلک یاد غم
مرے اوج سر پر پڑی آن خاک   پسر کو کیا میں نے ناحق ہلاک
یہ کہہ کر وہیں کھینچ خنجر لیا   کہ تن سے کرے اپنی گردن جدا
پکڑ کے شتابی سے رستم کا ہات   لگے رونے گودرز فرخ صفات
زوارہ نے پارہ گریباں کیا   غم و درد سے شور و افغاں کیا
کہا پھر یہ سہراب کیا ہے حال   وہ بولا کہ ہے درد مجھکو کمال
جگر پر مرے زخم کاری لگا   نہیں کچھ بھروسا اب زیست کا
ملے پہلتن کے سراپا نشاں   مری ماں نے مجھ سے کہے تھے عیاں
بہتیرا[1] سیہ بخت سے بارہا   جو پوچھا تو پوشیدہ اس نے رکھا
مجھے نام رستم بتایا نہیں   رکھا ہائے غافل جتایا نہیں
مقابل مرے جبکہ رستم ہوا   تو پرسان حال اس سے ہر دم ہوا
رکھا اس نے بھی نام اپنا نہاں   کیا پھر آگے نہ ہرگز عیاں
کوئی کیا کرے کس کا ہے اختیار   نہیں چارہ تقدیر سے زینہار
پسر کی اجل باپ کے ہاتھ تھی   ازل سے یہ ٹھہری ہوئی بات تھی

سہراب نے مرتے مرتے اپنے باپ اور حاضرین کو جو وصیت کی ہے اس میں جذبۂ حب وطن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، جو ذیل میں قابل ملاحظہ ہے ـــ

یہ سہراب دلخستہ نے پھر کہا   کسی کو نہیں اس جہاں میں بقا
نہ تم گریہ و نالہ اتنا کرو   ذرا صبر کو دل میں اب راہ دو
بحل تم کو میں نے کیا اپنا خوں   ہے التماس ایک کہتا ہوں
کہ زنہار اب رستم ارجمند   نہ پہنچائے لشکر کو میرے گزند
نہ ہو جا کے ترکوں سے پھر کینہ خواہ   نہ کھینچے سوئے ملک توراں سپاہ
کہ مولد مرا ملک توران ہے   یہی جائے بازی و میدان ہے
اگر زندہ رہتا تو ہر ایک پہ   مراعات کرتا میں شام و سحر
پدر جد میرے مدارا کرے   تلطف مدام آشکارا کرے
جگر خستہ نے جو کہ اس دم کہا   تہمتن نے یکسر پذیرا کیا

مذکورہ بالا منقول بہ تبدیل املا پیش کی گئی ہیں۔ شاہنامے کا املا قدیم طرز کے مطابق ہے۔

مول چند منشی جس دور سے متعلق ہیں اس میں تصنع اور آورد کی بہتات تھی۔ شاعر علوم شعریہ کی مدد سے شعر کو چیستان بنا دینے کی کوشش کیا کرتے تھے اور یہی اس زمانے کا معیار استادی و کمال تھا۔ پھر "شاہ نصیر" تو گویا دلی کے شیخ ناسخ ہیں جن کے کلام میں شیخ ناسخ کی تمام خصوصیات موجود ہیں[4]۔ مولچند منشی انہی کے شاگرد تھے۔ ایسی صورت میں اگر ان کے کلام میں استاد کی خصوصیات پائی جائیں تو تعجبات سے نہیں۔ لہٰذا ناموزوں نہ ہوگا اگر ان کے کلام کو اس وقت کے معیار کے مطابق علوم شعریہ کی روشنی میں دیکھا جائے اور ذیل میں چند

---

[1] ہجیر ایرانیوں کی فوج کا ایک سردار تھا جس کو سہراب نے قید کر لیا تھا۔ سہراب اس کو ایک اونچی جگہ پر لے گیا اور ایران کے دلاور و جنگجو سرداروں کی اس سے واقفیت حاصل کی۔ گو وہ بھی رستم کا نام و نشان چھپا گیا کیونکہ اس کو ڈر تھا کہ سہراب، رستم ایسے قوی ہیکل پہلوان کو مار نہ ڈالے کہ ایران کی آخری امیدیں اسی کے دامن سے وابستہ تھیں۔ [4] شعر الہند جلد اول صفحہ ۱۴۲۔

[2] تہمتن رستم کا لقب ہے جو مرکب ہے تہم بمعنی بزرگ و قوی اور تن بمعنی جثہ و جسم سے۔ رستم کو اس کے قد آور اور قوی ہونے کی بنا پر یہ لقب دیا گیا تھا۔

[3] رستم نے اپنی بیوی کو رخصت کرتے وقت ایک مہرہ دے دیا تھا کہ اگر لڑکا ہو تو بطور نشانی وہ مہرہ اس کے بازو سے باندھ دے۔ مگر جب لڑکا پیدا ہوا تو بیوی نے اس کو ضعیف و نازک بتا کر رستم سے کہلوا دیا کہ لڑکی ہوئی ہے کیونکہ وہ جذبۂ خلوص کی حاجت میں تھا۔ بیوی کو اندیشہ ہوا کہ رستم کہیں لڑکے کی خبر سن کر اس کو لڑنے کو نہ مار ڈالے۔

معائب و محاسن بھی ناظرین کر دیے جائیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

ہر اک طرح تھا اژدہا گرگیں بزنگ   بڑے کینہ آور تھا مانند گرگ

جس کے الفاظ "گرگ" و "گرگیں" میں صنعت تجنیس مذیّل ہے جو کسی لفظ استعمالہ شعر میں دو حرف زائد لانے سے پیدا ہوتی ہے۔

اسی ذیل میں شاہنامے کے یہ شعر ہیں ؎

گئے جبکہ وہ سامنے سام کے   تو پھر وہ بھی تعظیم کے واسطے

سیامک کا اک پور ہوشنگ تھا   کہ رستا بہا ہوش فرہنگ تھا

دو لفظوں کے ابتدائی حروف کا مختلف اور باعتبار تلفظ قریب الآواز ہونا صنعت تجنیس مضارع کہا جاتا ہے۔ جس کی مثال یہ ہے ؎

سنا ہے کہ اپنے بزرگ صلاح   کہ تو اور طوس آئے بادل سلاح

شعر ذیل صنعت تجنیس خطی کا حامل ہے ؎

ہوا اس کا گھوڑا وہاں سے فرار   لیا فوج کا خانہ زبان اس نے قرار

اس میں صنعت تجنیس لاحق بھی ہے کہ حروف ابتدائی "ف" اور "ق" بعید المخرج ہیں۔ شاہنامے میں صنعت تجنیس کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

اگر کسی شعر کے مصرعۂ اول کے جزو اول یعنی صدر میں ایک لفظ لایا جائے اور پھر وہی عجز یعنی مصرعۂ ثانی کے جزو آخر میں واقع ہو تو اس کو صنعت ردّ العجز علی الصدر کہتے ہیں جو ذیل کے شعر میں رکھی گئی ہے ؎

دروغ آگے مردم کے ہے بے فروغ   بھلا کس لئے کوئی بولے دروغ

اسی طرح اگر حشو یعنی مصرعے کے درمیانی حصے میں کوئی لفظ ہو اور وہی عجز یعنی مصرعے کے حصۂ آخر میں تو اس کو صنعت ردّ العجز علی الحشو کہتے ہیں جیسے ؎

وہیں پر جہاندار فیروز بخت   بچھا ایک تخت اپنے پہلو میں تخت

ذیل کے شعر مصرعۂ ثانی میں صنعت منفصل الحروف یا مقطع ہے جس میں مل کر آنے والا کوئی حرف نہیں۔ نیز اس میں چونکہ نقطے دار حرف کوئی نہیں اس لئے یہ صنعت مہملہ کا بھی حامل ہے جس کو عاطلہ و غیر منقوطہ بھی کہتے ہیں ؎

دلیکن بروز جزا بے گماں   کہ ہے داور دی داور داوراں

شعر مندرجہ ذیل میں صنعت ترصیع ہے۔ جس میں ایک مصرعے کا ہر لفظ دوسرے مصرعے کے ہر لفظ کا ہم قافیہ ہے ؎

ادھر سے جہاندار کشورستاں   ادھر سے سپہدار مازندراں

کسی شعر میں اگر پہلا مصرعہ دوسرے مصرعے کی پلٹ ہو تو اس کو صنعت عکس کہتے ہیں جو شعر ذیل میں موجود ہے ؎

ہوئے پہلواں عاشق دلستاں   ہوئے دلستاں عاشق پہلواں

اسی طرح صنعت مبالغہ کی تیسری قسم غلو جو خلاف عقل و عادت ہوتا ہے۔ ذیل کے شعر میں پائی جاتی ہے ؎

غرض اس طرح ترک گشتے ہوئے   کہ کشتوں کے تا چرخ پشتے ہوئے

صنائع کے بعد کلام منشی کے چند عیوب بھی قابل ملاحظہ ہیں جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

علم قافیہ میں ردی سے پہلے حرف ساکن غیر مدہ کو جو قبل روی بلا فصل واقع ہو حرف قید کہتے ہیں۔ قافیے میں اس کا اختلاف معیوب ہے جو ذیل کے شعر میں پایا جاتا ہے ؎

جو لائق میں چینیاں کو دخل   کیا انجمنوں کو اسیر اور قتل

یہاں قافیے میں لام حرف روی ہے اور "خ" و "ت" حروف قید جو مختلف ہیں لہٰذا معیوب۔

ہوئی جب سلطان پور ان تخت   بخشش مرہی زیبا ہو تخت

اس میں قید کی حرکت ماقبل کا اختلاف ہے۔ قافیے کے اس عیب کو سناد کہتے ہیں۔

مندرجہ ذیل شعر میں ایطائے جلی ہے ؎

لیا خسرو نامور نے خراج   دیا اس کو ہر تاجور نے خراج

اس کے قوافی "نامور" اور "تاجور" میں "ور" الحاقی ہے۔ جس کو دور کر دینے پر حرف روی قائم نہیں رہتا جو داخل عیب ہے اور جس کو ایطائے جلی کہتے ہیں۔

مصرعۂ اول میں ایسا قافیہ لانا کہ اس کے معنی مصرعۂ ثانی پر موقوف ہوں معیوب ہے۔ جیسا کہ حسب ذیل مثال میں ؎

تو مائل ہوا سوئے کشتی اگر   تو واں میں بھی کشتی کو حاضر ہوں پر

نہیں چاہتا پر کہ تجھ سا جواں   مرے ہاتھ سے کشتہ ہووے یہاں

مندرجہ ذیل شعر میں لفظ کی صورت بدلی ہوئی ہے ؎

لگا کہنے یوں شیدۂ نامدار   مجھے میل کشتی ہے اے شہریار

اس میں "شیدائے" کو "شیدۂ" لکھا ہے۔ جبکہ قاعدہ یہ ہے کہ جس لفظ کے آخر میں الف ہو اس کو بشمول یائے تحتانی موصوف و مضاف کرتے ہیں تاکہ کسرۂ متعلق ظاہر ہو۔ مگر یہاں منشی نے اس قاعدے سے چشم پوشی کی ہے۔ اسی اصول کے پیش نظر آتش کے شعر میں "حلوۂ بے دود" اعتراض کی زد میں ہے۔

مزید یہ کہ بخیال عنوان غزلوں کا انتخاب اس مضمون میں پیش نہیں کیا گیا جو آثار الشعرائے ہنود اور گلشن بے خار وغیرہ تذکروں میں موجود ہے۔

طلبہ کوئی ہندوستانی زبان اختیار کر سکتے ہیں

مولانا حفظ الرحمٰن سے وزیر اعظم کی وضاحت

وزیر اعظم نے مولانا حفظ الرحمٰن کے ایک خط کے جواب میں انھیں یقین دلایا ہے۔ قومی یک جہتی کانفرنس میں جو سہ لسانی فارمولا تجویز کیا گیا تھا اس میں اُردو بھی شامل ہے۔ خط کا متن حسب ذیل ہے۔

محترم مولانا صاحب

آپ کا خط مورخہ ۲۵ر جون ۶۲ء جو شری سی۔ بی گپتا کے نام ہے موصول ہوا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس اور قومی یک جہتی کانفرنس میں جو فارمولا طے ہوا ہے وہ سہ لسانی فارمولا ہے۔ یعنی (۱) ہندی، (۲) انگریزی یا کوئی دوسری غیر ملکی زبان اور (۳) کوئی ہندستانی موجودہ زبان ہندی کے علاوہ۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس میں اُردو شامل ہے۔ اس بارے میں کچھ اندیشہ تھا چنانچہ میں نے وزیر تعلیم کو اس بارے میں خط لکھا اور انہوں نے اس معاملے کو اسی طرح واضح کیا ہے جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ علاج سے آپ صحتیاب ہو رہے ہوں گے۔

آپ کا مخلص

جواہر لال نہرو

تین زبانوں کی تعلیم میں اُردو کی شمولیت

مرکز کی وضاحت سے ریاستی حلقے غیر مطمئن

قومی آواز (لکھنؤ) کے اسٹاف رپورٹر کا بیان ہے کہ ریاست کے ہائر سکنڈری اسکولوں میں تین زبانوں کو پڑھانے کا فارمولا شاید آئندہ تعلیمی سال تک نافذ نہیں کیا جائے گا۔

یہاں کے سرکاری حلقے محسوس کر رہے ہیں کہ اس فارمولے کا اصل مقصد جنوبی اور شمالی ہندوستان کے بسنے والوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنا اور ان کے نقطۂ نظر اور خیالات میں اس طرح یک جہتی پیدا کرنا تھا لیکن شمالی ہندوستان کی زبانوں کو اور خاص کر اُردو کو سہ لسانی اسکیم میں شامل کرنے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

ان سرکاری حلقوں کے خیال میں کچھ دن قبل مرکزی حکومت کی طرف سے اس سلسلے میں جو وضاحت کی گئی تھی کہ ہندوستان کی جدید بولی جانے والی زبانوں میں سے صرف ایک زبان سہ لسانی فارمولے میں شامل کی جائے اس سے معاملے میں اور پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔

ان حلقوں کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ دستور کے گوشوارے میں سنسکرت بھی شامل ہے اور گوشوارے کی دوسری زبانوں کو سہ لسانی فارمولے میں شمولیت کا جتنا حق ہے اتنا ہی حق سنسکرت کو ہے۔

ان حلقوں کے خیال میں اُردو زبان ہندی سے اتنی قریب ہے کہ اس کو ہندی سے الگ کوئی زبان قرار دینا قومی یک جہتی کے منافی ہے اس کو تین زبانوں کی لازمی تعلیم میں شامل کرنا مقصد کے لئے مفید نہ ہوگا۔ اُردو اور ہندی زبانیں بولنے میں ایک ہی ہیں، صرف رسم خط کا فرق ہے۔ نیز ہندی بولنے والے اور اُردو بولنے والے اس قدر ایک دوسرے کے قریب ہیں کہ ان دونوں زبانوں کو اس مقصد کے ماتحت پڑھانا بالکل غیر ضروری ہے کہ دونوں زبانیں بولنے والے قریب ہوں اور قومی یک جہتی کے مقصد کو فروغ ہو۔

بہر حال خیال کیا جاتا ہے کہ ریاستی حکومت اس سلسلے میں مرکزی حکومت سے مزید وضاحت چاہے گی۔

ٹنڈن جی اُردو اصطلاحات کو پسند کرنے لگے تھے

الٰہ آباد کے سابق میئر مسٹر سی بی راؤ نے اخباری نمائندہ کو بتایا کہ ہندی پریمی مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن کے نظریہ میں ان کی موت کے کچھ دنوں پہلے تبدیلی آگئی تھی وہ اس خیال کو ماننے لگے تھے کہ اُردو یا انگریزی کے وہ الفاظ جو عام بول چال میں مستعمل ہیں، انھیں ہندی میں مروّج رہنے دیا جائے۔

مسٹر راؤ نے کہا کہ یہ سوچنا غلط ہے کہ مسٹر ٹنڈن ہمیشہ شدید ہندی کے پریمی اور قدامت پرست رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی عملی زندگی کی طویل مدت تک وہ شدید ہندی کے پریمی تھے مگر موت سے کچھ دنوں پہلے ان کے خیالات میں تبدیلی آگئی تھی اور وہ انگریزی اور اُردو کی مروجہ اصطلاحات کو ہندی میں استعمال کرنے کے حق میں ہو گئے تھے مسٹر راؤ نے کہا کہ موت سے کچھ دنوں پہلے ایک گفتگو میں مسٹر ٹنڈن نے بتایا تھا کہ غیر ہندی والوں کو ڈرانے یا جبر کرانے کی بجائے انھیں ہندی کی طرف مائل کرنے کی ضرورت ہے۔

رام پور میں جشن اثرؔ

نومبر سنہ ۱۹۶۱ء کے پہلے ہفتے میں، رام پور کے نوجوان ادیبوں نے محمد علی خاں اثرؔ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے جشن اثرؔ کی پہلی قسط منائی، اور دو شاندار ڈرامے پیش کئے، جس میں حصّہ لینے والے، زیادہ تر ادیب اور شاعر تھے۔ مارچ سنہ ۱۹۶۲ء میں اس جشن کی دوسری قسط پیش ہوئی یعنی مقالات اور بیت بازی، مقالہ نگار سلطان اشرف، مسرت حسین آزاد، شکیب امیوری اور دلدار نصری تھے۔ بیت بازی رام پور کے بزرگوں (بزرگ شعرا وغیر شعرا) اور چھوٹوں کے درمیان ہوئی جس کی صدارت شاد عارفی نے فرمائی۔

جشن کی کل آمدنی پونے سات سو روپے ہوئی اور کل خرچ پونے نو سو۔ چندہ دینے والوں میں راز یزدانی صاحب، عرشی صاحب، اکبر علی صاحب، منشی مجید صاحب، بتوا خاں، اچھے میاں، شکیب صاحب، دلدار نصری، شکیل ساز، عبدالحمید خاں اور (ہر ایک ۲۵ روپے) قابل ذکر ہیں۔

معاصرین

وزیر اعظم کی وضاحت

مولانا حفظ الرحمٰن نے امریکہ سے جہاں وہ کینسر کے علاج کے لئے گئے ہوئے تھے اُتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کو ایک خط میں لکھا تھا کہ اس ریاست میں سہ لسانی فارمولا کو جس طرح رائج کیا جارہا ہے اس سے اُردو کے مفاد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہے۔ فارمولا وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس میں مرتب کیا گیا تھا اور قومی یک جہتی کانفرنس نے بھی اس کی تائید کی تھی۔ اس طرح جہاں تک اس کے محرکات کا تعلق ہے ان میں کوئی عصبیت نہیں تھی۔ اس کی غایت ایک تو یہ تھی کہ شمالی اور جنوبی ہند کے باشندوں پر زبانوں کا بوجھ یکساں رہے اور ایسا نہ ہو کہ جنوبی ہند والوں کو اپنی مادری زبان کے ساتھ انگریزی اور ہندی پڑھنا پڑے جب کہ شمالی ہند والوں کو جن میں سے ایک بڑی تعداد کی مادری زبان ہندی ہے اس کے علاوہ صرف انگریزی پڑھنا پڑے۔ دوسری غایت اس فارمولا کی یہ تھی کہ ہندستان کے شمالی اور جنوبی حصّوں کو جذباتی اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔

مولانا نے وزیر اعلیٰ کو لکھا تھا کہ اس فارمولا کے محرک و منشا سے انھیں اختلاف نہیں ہے۔ لیکن ان کے لئے یہ بات تکلیف دہ تھی کہ اس فارمولا کے رائج ہوجانے پر اُردو کی تعلیم کی گنجائش ختم ہوجاتی۔ انھوں نے اور بہت سے دوسرے ذمّہ دار اشخاص نے بھی اس فارمولا کا تجزیہ اس طرح کیا تھا کہ تعلیم کی ثانوی منزل پر طالب علم کو ایک تو ہندی پڑھنا ہوگی دوسرے ایک غیر ملکی زبان یعنی انگریزی اور تیسرے جنوبی ہند کی کوئی زبان۔ یہی بات یوپی ایجوکیشن بورڈ کے مئی والے ایک جلسے کی روداد، اور ودھان سبھا میں وزارت داخلہ کے وزیر شری پی این دتار کے پچھلے ہفتے والے ایک بیان سے بھی مترشح ہوتی تھی، اور حکومت یوپی نے جنوبی ہندستان کے اخباروں میں زیادہ ٹیچروں کی ضرورت کے جو اشتہارات شائع کرائے تھے ان سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے کہا تھا کہ تیسری زبان کی حیثیت سے جنوبی ہند کی زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو کو بھی شامل کرلیا جائے اور انھوں نے وزیر اعلیٰ کے نام اپنے خط کی نقل وزیر اعظم کو بھی بھیج دی تھی اس لئے کہ قومی یک جہتی کی تحریک سے انھیں خاص دلچسپی ہے۔

وزیر اعظم نے مولانا کو جو جواب بھیجا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ فارمولا کا مقصد اُردو کو خارج کرنا یا نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس فارمولا کے تحت تیسری زبان کوئی موجودہ ہندستانی زبان ہندی کے علاوہ ہوگی۔ اور یہ کہ "اس میں اُردو شامل ہے"۔ وزیر اعظم کے استفسار پر مرکزی وزیر تعلیم نے بھی مذکورہ فارمولے کی وضاحت اسی طرح کی ہے۔ اُردو کا شمار نہ صرف حقائق بلکہ دستور کی بنا پر بھی ہندستان کی زبانوں میں ہوتا ہے۔ اور سہ لسانی فارمولا کے تحت اُردو کی تعلیم چاہئے اور اس کا بندوبست کرنے میں کوئی رُکاوٹ نہیں ہے۔

اس فارمولے کی جو اغراض ہیں ان کی تکمیل میں بھی اُردو سے بڑی مدد مل سکتی ہے اس لئے کہ اُردو اپنی ابتدا اور ارتقا کے اعتبار سے قومی یک جہتی کا ایک نمایاں نشان اور اس کے حصول کا ایک بہت ہی اہم ذریعہ ہے۔ یہ زبان نہ صرف یہ کہ اُتر پردیش کے ایک خاصے بڑے حصّے میں بلکہ ملک کے دوسرے حصّوں میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ چند سال پہلے تک جو سلوک کیا جاتا تھا اس کی وجہ سے قومی یک جہتی کو نقصان پہنچا ہے۔ شمالی ہند اور جنوبی ہند کی یک جہتی اور تہذیبی میل جول کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن اتنی ہی ضروری یہ بات بھی ہے کہ شمالی ہند میں بسنے والے مختلف طبقوں اور فرقوں میں یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ اس معاملے میں اُردو سے خاصی بڑی مدد مل سکتی ہے۔

اُردو کی تعلیم رائج کرنا نسبتاً آسان بھی ہے۔ اس لئے کہ اُتر پردیش کے چھ ہزار سکنڈری اسکولوں کے لئے جنوبی ہند کی زبانیں پڑھانے والے استادوں کا بندوبست بہت مشکل اور بہت مہنگا پڑے گا۔ اسی مشکل کی وجہ سے فارمولا کا نفاذ ابتدائی سرگرمی کے مظاہرے کے بعد ملتوی کردیا گیا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ التوا کتنا طویل ہوگا اور جب فارمولے کو نافذ کیا جائے تو وہ کتنے شہروں اور قصبوں میں نافذ کیا جاسکے گا۔ لیکن جہاں تک اُردو کا تعلق ہے اس کے جاننے والے مدرسین ریاست بھر میں موجود ہیں، اور ان کی خدمات کسی دشواری کے بغیر حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اگر تیسری زبان کے تحت اُردو کو شامل کرلیا جائے تو سہ لسانی فارمولا فوراً ہی رائج کیا جاسکتا ہے۔ اسے رائج کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ریاست کے بعض حصّوں میں جنوبی ہند کی زبانوں میں سے کسی ایک کو اور بعض میں اُردو کو ہندی اور انگریزی کے ساتھ پڑھایا جائے۔

(قومی آواز، لکھنؤ)

[illegible]

طرزِ ستم

پچھلے دو تین ماہ سے ہندی کو عام فہم بنانے کے لئے جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ واقعی قابلِ ستایش ہیں۔ سابقہ مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات نے ہندی کو دشوار تر اور ناقابلِ فہم بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب بیچاری ہندی کو ان کی آہنی گرفت سے گلو خلاصی نصیب ہوئی۔

نئی مرکزی وزارت کے قیام کے بعد سے اس سلسلے میں کافی بحث و مباحثہ ہو رہا ہے۔ خود پنڈت نہرو نے ہندی کو آسان تر بنانے کے تعلق سے پارلیمنٹ میں ایک بیان بھی دیا ہے (اس سے قبل وہ پارلیمنٹ میں کئی بار شکایت کر چکے ہیں کہ ریڈیو کی ہندی اُن کی سمجھ میں بالکل نہیں آتی۔ لیکن کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ سابقہ وزیر اطلاعات کے سامنے اُن کی بھی کچھ پیش نہ گئی۔

"آسان ہندی" کی مہم کے سلسلے میں آل انڈیا ریڈیو میں ایک مشاورتی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس کمیٹی کا کام یہ ہوگا کہ ثقیل ہندی الفاظ خارج کر کے ان کی جگہ عام فہم الفاظ رکھے جائیں۔ کمیٹی نے اپنا کام شروع کر دیا ہے اور کئی متبادل الفاظ ڈھونڈ بھی نکالے ہیں۔ یہ جذبہ قومی اور لسانی اعتبار سے بہت نیک ہے لیکن اس کے پیچھے بیچاری اُردو کے گلے پر خواہ مخواہ چھری چل رہی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو سے اب تک اُردو میں جو خبریں نشر ہوتی تھیں ان میں "وزیر اعظم" کا استعمال بہت عام ہے جسے ملک کا ہر طبقہ سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اب اُردو خبروں میں "وزیر اعظم" کی بجائے "پردھان منتری" کے الفاظ استعمال کئے جائیں گے۔ اسی طرح اور بھی کئی اُردو الفاظ ایسے ہیں جو نہایت عام فہم ہیں لیکن انھیں بھی ریڈیو اسٹیشن سے نکال باہر کیا جا رہا ہے اور ان کی جگہ ہندی الفاظ رکھے جا رہے ہیں۔ یہ عمل اگر ہندی خبروں کی حد تک ہوتا تو ہمیں بالکل اعتراض نہ ہوتا لیکن اُردو کی خبروں میں خالص ہندی الفاظ کا استعمال کہاں تک مناسب ہے۔ ہندی کو آسان بنانے کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہونا چاہیئے کہ اُردو کا بلا وجہ قتل کیا جائے۔ کمیٹی کا قیام اس لئے عمل میں آیا ہے کہ ہندی کو آسان بنایا جائے نہ کہ اس لئے کہ اُردو کو نکال کر اس کی جگہ ہندی کو بٹھایا جائے۔

ہمیں امید ہے کہ حکومت اور بالخصوص ہمارے موجودہ وزیر اطلاعات و نشریات جو اُردو کے واقعی ایک عملی اور مخلص ہمدرد ہیں اس بارے میں غور کریں گے۔

(دورِ حیات۔ بمبئی)

بزمِ ادب رتناگیری

بزمِ ادب نیشنل ہائی اسکول رتناگیری (مہاراشٹرا) کے پہلے جلسے (منعقدہ ۲۴ر جولائی) میں سالِ رواں (۶۳-۱۹۶۲ء) کے لئے حسبِ ذیل عہدہ دار باتفاق آراء منتخب ہوئے۔

صدر: جناب ایم۔ اے پرکار، نائب صدر: عبد اللطیف سولکر صاحب، معتمد: عثمان قاضی صاحب، خازن: فاروق سوپیکر صاحب، مشیرانِ کار: جناب خاور بانکوٹی اور جناب افضال احمد جلیل۔

انجمن تعمیرِ اُردو دلّی

۲۲ر جولائی سنہ ۱۹۶۲ء کو انجمن تعمیرِ اُردو دلّی کی پندرہ روزہ ادبی و تنقیدی نشست زیرِ صدارت قمر فرشوری (پرنسپل فتحپوری مسلم ہائر سیکنڈری اسکول دلّی) منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے ایک مقالہ بعنوان "استاد ذوق کی خدماتِ زبان و ادب" پیش کیا۔ مقالہ میں "خاقانیِ ہند" کی ادبی معرکہ آرائیاں، استادی، اُردو زبان و محاورہ کی اسنادِ بیان کی صحت، علمی فضیلت، اُردو قادر الکلامی پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

آندھرا پردیش اُردو رائٹرز کوآپریٹیو سوسائٹی

حیدرآباد میں اُردو رائٹرز پبلشنگ کوآپریٹیو سوسائٹی آندھرا پردیش کے قیام اور اس کے قواعد و ضوابط کی منظوری کے لئے ۴ر جولائی کو اُردو ہال حمایت نگر میں اراکین کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت قاضی عباد الضاری نے کی۔ بسر یاد جواد انوری، اکبر الدین صدیقی، سلیمان اریب، مغنی تبسم، راشد اور متین سروش، پروفیسر سید محمد، پروفیسر ابو ظفر عبد الواحد اور عالم خوندمیری نے مباحثہ میں حصہ لیا جس میں بالاتفاق پانچ سو روپے کے حصص کی خریداری ختم کر کے صرف سو روپے کے حصص باقی رکھے گئے اور قواعد و ضوابط منظور کئے گئے۔

بھوپال کے ایک فلاحی مرکز کیلئے اردو کتابیں

مدھیہ پردیش اسمبلی میں شاکر علی خاں کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے وزیر محنت نے اعتراف کیا کہ بھوپال ٹکسٹائل ملز کے فلاحی مرکز میں اُردو اخبارات و رسائل نہیں آتے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے اس کا یقین دلایا کہ اُردو پڑھنے والوں کی تعداد کے پیشِ نظر اب جلد ہی اس فلاحی مرکز کے لئے اُردو ادب کا ذخیرہ بھی فراہم کیا جائیگا۔

ضروری اعلان

براہِ مہربانی خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ منیجر

مراسلہ

کچھ "دکن ریویو" کے بارے میں

۲۲ اپریل ۱۹۶۲ء کے اخبار "ہماری زبان" میں جناب بشیر الحق صاحب دسنوی نے "دکن ریویو" حیدرآباد کے متعلق جو مضمون تحریر فرمایا ہے اُس کو پڑھ کر میرے لئے ضروری ہو گیا کہ بادلِ ناخواستہ ہی سہی لیکن چند واقعات کی تشریح بلکہ تصحیح کی غرض سے اپنی ذاتی معلومات کا اظہار کر دوں۔

اخبار کے صفحہ ۲ پر مضامین کی فہرست ختم ہونے کے بعد بشیر الحق صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ "تیسری جلد کی تکمیل کے بعد ایڈیٹر مولوی ظفر علی خاں صاحب کی طبیعت بُری طرح ناساز ہو گئی اور ان کی شدید علالت کے باعث اکتوبر ۱۹۰۵ء تک دکن ریویو بند رہا...... سلسلہ جدید...... بمبئی سے نکلنا شروع ہوا...... جنوری فروری ۱۹۰۶ء کے پرچے (۳-۴) بمبئی میں تیار کئے گئے تھے۔ ایڈیٹر ظفر علی خاں صاحب کے دفعتاً حیدرآباد چلے آنے کی وجہ سے ان کی اشاعت معرضِ التوا میں آ گئی اور یہ دونوں مشترکہ نمبر ناظرین کی خدمت میں حیدرآباد سے بھیجے گئے۔ پھر مارچ ۱۹۰۶ء سے سلسلۂ جدید کے پرچے حیدرآباد سے نکلنے لگے مگر............"

مندرجہ بالا عبارت پڑھنے کے بعد یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ایڈیٹر صاحب کی شدید علالت کے باعث اول تو "دکن ریویو" بند رہا اُس کے بعد بمبئی سے نکلا اور پھر ایڈیٹر صاحب کے دفعتاً حیدرآباد چلے آنے کی وجہ سے حیدرآباد ہی سے نکلتا رہا۔ بظاہر یہ واقعات کسی تشریح کے محتاج نہیں معلوم ہوتے لیکن حُسنِ اتفاق سے میرے دماغ میں جو تصویر ہے اس کے خد و خال مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے "علالت" اور "دفعتاً حیدرآباد چلے آنے" کی تشریح کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے امرِ واقعہ کے اظہار کو ضروری خیال کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۹۵ء میں مولوی ظفر علی خاں صاحب مرحوم اور میرے والد مولوی سید محفوظ علی صاحب بدایونی طاب ثراہ نے ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ سے ایک ساتھ بی۔ اے پاس کیا۔ اول الذکر نے حیدرآباد (دکن) پہنچ کر ملازمت اختیار کی اور حضرت قبلہ گاہی صاحب مرحوم ریاست خیرپور سندھ میں نائب وزیر مقرر ہو گئے۔

۱۸۹۸ء کے اوائل میں حضرت قبلہ خیرپور سے مستعفی ہو کر بدایوں اپنے وطن تشریف لائے۔ کچھ دن بعد اپنے ہم سبق اور عزیز دوست مولوی عبد الحق صاحب مرحوم (بابائے اُردو) اور مولوی ظفر علی خاں صاحب کے اصرار پر حیدرآباد (دکن) پہنچے اور ملازم ہو گئے۔

ان تینوں دوستوں کی شام کی نشست مولوی عزیز مرزا مرحوم (ہوم سکریٹری حیدرآباد گورنمنٹ) کے یہاں مقرر تھی۔ مولوی ظفر علی خاں کے رسالہ "افسانہ" نے ایک ایسی ہی نشست میں جنم لیا۔ مولوی عبد الحق صاحب اور والد مرحوم کو رسالہ "افسانہ" اور "مسٹریز آف لندن" ناپسند تھے۔ کچھ دن بعد "افسانہ" بند کر دیا گیا اور جنوری ۱۹۰۴ء سے دکن ریویو نکلنا شروع ہوا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ قبلہ و کعبہ مولوی سید محفوظ علی صاحب نے اپنے نام سے لکھنے کی بجائے اکثر فرضی ناموں سے مضامین لکھے۔ چنانچہ "دکن ریویو" میں بھی کمتر مضامین اپنے نام سے اور بیشتر مضامین نقاش اور دوسرے ناموں سے لکھتے رہے۔ ۱۹۰۵ء ہی کے دوران میں سر تھیوڈور ماریسن پرنسپل ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کی سفارش پر برٹش ہائی کمشنر لندن کے دفتر سے میرے والد صاحب مرحوم کو سمالی لینڈ (Somaliland) افریقہ کے شہر بربرہ (Berbera) میں مجسٹریٹ مقرر کر دیا گیا اور وہ حیدرآباد کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر سمالی لینڈ چلے گئے۔

"افریقہ کا مسافر" وہ خط ہے جو انہوں نے جہاز پر سے مولوی ظفر علی خاں صاحب کو لکھا تھا اور جو دکن ریویو میں شائع ہوا۔ ۱۹۰۵ء میں دکن ریویو بدستور شائع ہوتا رہا۔ اوائل ۱۹۰۶ء میں ایک نظم "داکنامہ" لکھنے کے سلسلے میں مولوی ظفر علی خاں صاحب ریاست حیدرآباد کی ملازمت سے برطرف اور شہر بدر کر دئے گئے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۰۶ء میں وہ قبلہ گاہی صاحب مرحوم کے پاس سمالی لینڈ (افریقہ) پہنچ گئے اور دکن ریویو بند ہو گیا۔ دوستی کے تعلقات کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ والد مرحوم نے اولاً چھ ماہ کی رخصت حاصل کی اور پھر ملازمت کو خیرباد کہہ کر حقِ دوستی کی خاطر اپنے دس ہزار روپے کے سرمایہ سے بمبئی میں کاروبار شروع کر دیا۔ کالبا دیوی روڈ بمبئی میں ایم۔ اے۔ بشیر اینڈ کو کے نام سے دوکان کھولی گئی۔ ظفر علی خاں صاحب شریک کاروبار تھے۔ لیکن ظفر علی خاں کو دکن ریویو کی یاد بے چین کئے رہتی تھی چنانچہ انھوں نے بمبئی سے اُس کا احیا کیا۔ (آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ بمبئی سے دکن ریویو کیوں نکلا)۔

اب تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ فرمائیے۔ مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم اور ظفر علی خاں صاحب کے دوسرے ہمدرد شہر بدری کے احکام کو منسوخ کرانے اور ان کی بازماموری حیدرآباد کے لئے دو سال سے کوشاں تھے۔ مارچ ۱۹۰۷ء میں یہ کوششیں بار آور ہوئیں اور ظفر علی خاں صاحب حیدرآباد واپس پہنچ گئے۔ دکن ریویو ایک بار پھر حیدرآباد سے نکلنے لگا۔ میری سات پشت میں کسی نے کاروبار نہیں کیا تھا اور حضرت قبلہ کے جاننے والوں کو معلوم ہے کہ تجارت تو درکنار وہ تو اپنے آبائی پیشہ یعنی زمینداری کے کام کو بھی طوعاً و کرہاً انجام دیتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ اُن کا دفتر زمینداری باقاعدگی، نفاست اور سلیقہ کے اعتبار سے کسی سرکاری دفتر سے کم نہ تھا۔ اُن کا ذوق تو صرف علمی اور ادبی تھا اور اسی میں اُن کا بیشتر وقت گذرتا تھا۔ ایسی حالت میں بمبئی کی تجارت کا وہی حشر ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی "بشیر اینڈ کو" ختم ہو گئی، دس ہزار روپیہ ٹھکانے لگا اور حضرت قبلہ بدایوں آ گئے۔

مولانا ظفر علی خاں صاحب مرحوم کے بے تکلف دوست مولوی ظفر الملک صاحب علوی مرحوم ایڈیٹر الناظر نے ان جملہ واقعات کو تفصیل کے ساتھ ایک کتابچہ کی شکل میں "[illegible]" کے نام سے الناظر پریس سے شائع کیا تھا۔

(احسن علی بدایونی۔ بی۔ اے (عثمانیہ))

تبصرے

محمد عتیق صدیقی

ادارۂ ادبیات اُردو (رپورٹ ۱۹۶۱ء)

تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۸۰ صفحات، قیمت ۵۰ نئے پیسے۔
ملنے کا پتہ: ادارۂ ادبیات اردو، خیریت آباد، حیدرآباد نمبر ۴۔

ادارۂ ادبیات اُردو (حیدرآباد) کا نام محتاجِ تعارف نہیں ہے، جو گزشتہ تیس برس سے اُردو علم و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے ۱۹۳۱ء میں یہ ادارہ قائم کیا تھا اور آج تک وہی اس کے روح رواں ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اس ادارہ نے جو غیر معمولی ترقی کی ہے اس کو ڈاکٹر زورؔ کی سوجھ بوجھ اور لگن ہی کا کرشمہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اسی دَور میں ادارۂ ادبیات کو اپنی عمارت نصیب ہوئی، اور اسی دور میں اُردو میوزیم کا قیام بھی عمل میں آیا۔

اس رپورٹ میں سنہ ۱۹۶۱ء کی کارگذاری کے ساتھ ساتھ ادارے کی اجمالی تاریخ بھی درج ہے، جس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ "جنوبی ہند کے اس سب سے بڑے کتب خانے میں اُردو، فارسی اور عربی کی پچیس ہزار مطبوعہ اور پانچ ہزار سے زیادہ قلمی کتابیں بھی ہیں ــ جن کی فہرستیں بھی چھپ چکی ہیں"۔ ادارے نے اپنی تیس سالہ زندگی میں ۲۸۵ چھوٹی بڑی کتابیں بھی شایع کی ہیں۔ یہ تعداد و شمار کسی ادارے کے لئے بھی باعثِ افتخار ہو سکتے ہیں۔

اُردو علم و ادب سے دل چسپی رکھنے والوں کے لئے "ادارۂ ادبیات اُردو" کا مطالعہ دل چسپ ہونے کے ساتھ ساتھ مفید بھی ہو گا۔

شہر یاسا اور دریا تھمسی بہتا رہا

مصنف: تان کنگ یو۔ مترجم: جلیس عابدی۔
قیمت: ایک روپیہ۔
ملنے کا پتہ: نیشنل اکاڈمی، نمبر ۹، انصاری مارکیٹ دریا گنج۔ دہلی ۶

یہ ایک مختصر سا چینی ناول ہے جس میں چین کے موجودہ کمیونسٹ نظام کی مذمت کی گئی ہے۔ اسکی وضاحت پیش لفظ کے ایک جملے سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "چینی کمیونسٹ رہنماؤں نے اپنے تسلط سے پہلے جس جنت کی بشارت دی تھی، اس کا جب ظہور ہوا تو پتہ چلا کہ انسانی زندگی کا شرف ختم ہو چکا ہے"۔

انوارِ حیات

نور الدہر سروشؔ
قیمت ۷۵ نئے پیسے
ملنے کا پتہ: محمد حنیف بک ڈپو۔ ناگپور

انوارِ حیات برار کے ایک نئے شاعر نور الدہر کی نظموں کا مختصر سا مجموعہ ہے۔ خود شاعر کے بیان کے مطابق ان کا یہ مجموعہ ان کی "پہلی شعری پیش کش ہے۔ اور شاید ضلع بلڈانہ (برار) کے پہلے شاعر کا مجموعہ کلام بھی، جو اُردو میں شایع ہو کر منظرِ عام پر آ رہا ہے"۔

اس مجموعے میں چند بچوں کی نظمیں ہیں۔ ان کے علاوہ باقی سب قومی و سیاسی نظمیں ہیں، جو خلوص سے لکھی گئی ہیں اور شاعر کی فکری صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں۔

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کرخنداری اُردو کا لسانیاتی مطالعہ (بہ زبان انگریزی)
مصنف۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
ناشر۔ منشی رام منوہر لال اورینٹل اینڈ فارن بک سیلرز نئی سڑک۔ دہلی ۶۔
سائز۔ ۲۰×۳۰/۱۶۔ صفحات ۸۰۔ قیمت ۷٫۵۰ روپے

ہندوستان عربوں کی نظر میں۔ جلد دوم (ترجمہ)
ناشر۔ دار المصنفین شبلی منزل۔ اعظم گڈھ۔
سائز۔ ۱۸×۲۲/۸۔ صفحات ۴۱۰۔ قیمت ۳٫۵۰ روپے

گجرات کی تمدنی تاریخ (مسلمانوں کے عہد میں)
مولف۔ مولانا سید ابو ظفر
ناشر۔ دار المصنفین شبلی منزل۔ اعظم گڈھ
سائز۔ ۱۸×۲۲/۸۔ صفحات ۳۲۵

مرزا رسواؔ کے تنقیدی مراسلات
مصنف۔ مرزا محمد ہادی رسوا
مرتب۔ ڈاکٹر محمد حسن
ناشر۔ ادارہ تصنیف۔ علی گڑھ
سائز۔ ۲۰×۳۰/۱۶۔ صفحات ۲۳۸۔ قیمت ۳٫۵۰ روپے

اُردو مخطوطات (جلد اول و دوم)
(فہرست کتب خانہ آصفیہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری)
مرتب: نصیر الدین ہاشمی
ناشر: خواتین دکن انسٹی ٹیوٹ۔ حیدرآباد (آندھرا پردیش)
سائز۔ ۲۰×۳۰/۸۔ صفحات اول ۷۲۴۔ دوم ۷۰۲
قیمت۔ جلد اول مجلد دس روپے۔ غیر مجلد آٹھ روپے
" دوم " " "

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شایع کیا